ماہِ منیر

منیر نیازی

فہرست

نظمیں

غزلیں:

کھلے منظروں کی دنیا

(۱)

منیر نیازی کی شاعری ایک طویل جلا وطنی کے بعد وطن کی پہلی جھلک دیکھنے سے مماثلت رکھتی ہے۔اس شاعری میں حیران کر دینے اور بھولے ہوئے گم شدہ تجربوں کو زندہ کرنے کی ایک ایسی صلاحیت ہے جو اس عہد کے کسی دوسرے شاعر میں نظر نہیں آتی اس عہد کی اکثر شاعروں کی وابستگی نظریات یا علوم کے ساتھ ہے۔ جب کہ منیر کی وابستگی شاعری کی ''اصل'' یا شاعری کے جوہر کے ساتھ ہے۔خود کو بطور شاعر شناخت کر کے اپنے وجود کا بطور شاعر اور اک اور اس پر ایمان ،منیر کو اس عہد کے آدھے شاعروں کے درمیان ایک پوریشاعر کا رتبہ دیتا ہے۔

منیر نیازی کے نزدیک پورے عہد کے طرز احساس اور رویوں کا عطر ہے۔منیر اپنے رویوں اور نظریات کی منظوم تشریحیں'' نہیں کرتا وہ تو بے معنی تفصیل کا بھی قائل نہیں وہ چند سطور اور چند تصویروں میں اپنے عہد کے انسانوں اور ان کے رویوں کی اصل بنیاد کی طرف اشارہ کر دیتا ہے۔ پھر اگر آپ چاہیں تو ان تصویروں سے معانی کی تعویل داستانیں سے مرتب کر سکتے ہیں۔معانی کی انہی امکانی سمتوں کی وجہ سے منیر کی شاعری کو کسی ایک سطح یا عمر کسی ایک حصے سے وابستہ نہیں کیا جا سکتا۔ ہر سطح کا انسان اس شاعری میں اپنے ذہن کے مطابق سمتیں تلاش کر سکتا ہے۔

منیر کی شاعری میں انسانی زندگی کے جہنمی میدان بھی ہیں اور انسان کی کھوئی ہوئی جنت بھی ہے۔منیر نے انسانی کردار اور انسانی کے دونوں حصوں سے آنکھیں چار کی ہیں ،اگر اس کے یہاں ایک طرف قتل ،دہشت اور ویرانی کا علاقہ ہے تو دوسری طرف معصومیت ،حسن رنگوں کے خطے میں بھی ہیں ،منیر کی شاعری ان دونوں عناصر سے مل کر ہی اکائی صورت اختیار کرتی ہے۔

منیر کی شاعری انسان کو اس کی ذات کے اولیں نقش کی یاد دلاتی ہے سینی گال کا مشہور شاعر سینگور ایک نظم میں لکھتا ہے

"مجھے علم نہیں یہ سب کچھ کب ہوا تھا

میں تو بہشت اور بچپن کو ہمیشہ ایک دوسرے سے ملا دیتا ہوں "

منیر کی شاعری میں انسان کو اس کا بچپن اور بچپن کے ساتھ پیوست بہشت یاد دلانے کا جو جادو ہے اسی بات کا ظاہر ہے کہ منیر کی شاعری پر لکھتے ہوئے اکثر دوستوں کو اپنی چھوڑی ہوئی بستیاں یا اپنا بچپن یاد آیا ہے۔خود میں بھی اس شاعری کو اپنے بچپن اور اپنی اولیں

یادوں سے الگ نہیں کرسکتا. بلکہ میرا معاملہ تو باقی لوگوں سے بھی آگے کا ہے۔اس لیے کہ منیر نہ صرف مجھے میرا بچپن دولاتا ہے بلکہ بچپن اور بہشت کی سرحد پر میرے لہو میں گم شدہ بعض نا دیدہ بستیوں کو بھی میرے سامنے لاتا ہے، جہاں گھروں کی دیواروں پر مور بیٹھے رہتے تھے آموں کے باغوں میں کوئلیں بولتی تھیں اور آسمان پر ہر طرف کالی گھٹائیں ناچتی رہتی تھیں۔

بہر حال یہ منیر کی شاعری کے ساتھ میرا ذاتی رشتہ ہے۔اس کا زیادہ بیان میں اس وقت یہاں نہیں کرنا چاہتا، نہ ہی اس شاعری کو محض بچپن کی حدود میں رکھ کر سمجھا جاسکتا ہے۔اس لیے میں منیر کی تازہ کتاب "ماہ منیر" کے سلسلے میں چند باتوں پر اکتفا کروں گا۔

(۲)

یوں محسوس ہوتا ب جیسے "ماہ منیر" نئے مکانی فاصلوں کی وسعت کا سفر نامو ہے اسی لیے ان نظموں اور غزلوں کا تناظر جدید شاعری کی گھٹن اور تنگی مناظر سے بالکل علیحدہ ہے۔یہ ایک مسلسل سفر کی کائنات ہے اور یہ سفر اس کائنات کو پھیلاتا چلا جاتا ہے۔منیر نیازی کی نظموں اور غزلوں کا یہ نیا منطقہ ہمیں اک نئی کونیات Cosmolgy سے دوچار کر رہا ہے۔اس کونیات کی وسعت کے مقابل نگر کی زندگی " نظر بندی کا عالم "بن جاتی ہے اور مکان کی چار دیواری میں "خواہش سیر بسیط " صحن کی محراب میں فلک کا اثر دیکھا کر پرواز پر مائل کرتی ہے۔یہی مرحلہ ہے جہاں اجرام فلکی شاعر کے استعاروں علامتوں کی صورت میں ظہور کرتے ہیں

زمین دور سے تارہ دکھائی دیتی ہے
رکا ہے اس پہ قمر چشم سیربین کی طرح
فریب دیتی ہے وسعت نظر کی افقوں پر
ہے کو چیز وہاں سحر نیلمیں کی طرح

———

یہ تو ابھی آغاز ہے جیسے اس پہنائے حیرت کا
آنکھ نے اور سنور جانا ہے رنگ نے اور نکھرنا ہے

———

ماہ منیر کھلے منظروں کی کائنات ہے۔اس لیے ان نغموں میں بار بار چمک اور مختلف مظاہر پر اس چمک کے اثر کا بیان ہوا ہے۔ان نغموں اور غزلوں میں جو تصویریں بار بار سامنے آتی ہیں وہ اسی چمک اور اسی نور سے مناظر کی رنگت تبدیل ہونے کی داستان بیان کرتی ہیں. یہاں نیلے سمندر اور اس پر دھوپ کے شیشے کی چمک کا رشتہ بھی ہے اور کسی چشم نم پر مہر کی اولیں کرن کا اثر بھی، پرتو خورشید سے چمکتے ہوئے

دریچے بھی ہیں اور چاند کی روشنی کا مکانوں کی سیہ رنگت کے ساتھ پر اسرار رابطہ بھی۔ کھلے منظروں کی اس کائنات میں پھیلاؤ اور فراخ سمتی کے امکانات کی تلاش کا سفر ہر آن جاری رہتا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ اس کتاب میں "دشمنوں کے درمیان شام" کی نظموں کی طرح کائنات سے بنیادی رشتہ دشمنی کا نہیں اور نہ ہی "تیز ہوا اور تنہا پھول" اور "جنگل میں دھنک" کی بہت سی نظموں کی طرح جنگل کی زیادہ تصویریں نظر آتی ہیں۔ یہ نظمیں تو "صحرا یا میدان" کے تلازمات کو نئی معنویت دیتی ہیں۔ کھلے میدان یا صحرا میں ایک نئی کائنات آنکھوں کے سامنے ہے۔ اب چاند، ستارے، فلک، سورج اور خلا اس کی شاعری کے بنیادی اسم بن جاتی ہیں

نیل فلک کے اسم میں نقش اسیر کے سبب
حسن ہے آب وخاک میں ماہ منیر کے سبب

مکاں میں قید صدا کی دہشت
مکاں کے باہر خلا کی دہشت
زمیں پہ ہر سمت حد آخر
فلک پہ لا انتہا کی دہشت

ہو کشت ثمرور کہ ویراں چمن
نیا شہر امکاں کہ یادوں کا بن
ستارے میرے خواب امید کہ

اسی پس منظر میں خود "ماہ منیر" کے اسم کی معنویت بھی اجاگر ہوتی ہے۔ ان نظموں اور غزلوں میں تلازمات کا جو جھرمٹ ہے، اس کے وسیلے سے "چاند" اور "زمین" کے مابین کئی رشتے قائم رہتے ہیں۔ اس شاعری نظام میں مرکزی حیثیت چاند ہی کی ٹھہرتی ہے، اس لیے کہ "ماہ منیر" وہ اسم ہے جو منظروں کو تبدیل کر دیتا ہے۔ چاند نکلتے ہی سیہ خانوں کی رنگت بدلتی ہے اور آب وخاک میں حسن کا نور جاگتا ہے۔ ان نظموں میں چاند اور زمین کا تعلق حیرت کشش اور خوف کا ملا جلا تجربہ ہے اور اس تجربے سے ایک کونیاتی داستان عشق مرتب ہوتی ہے

"تیز ہوا اور تنہا پھول" میں چاند کے ساتھ جو تلازمے وابستہ تھے وہ قدیم زمانوں کے انسان کے ذہن کی کیفیات کے مظہر تھے۔ منیر کے اس اولیں مجموعۂ کلام کا چاند قدیم قبائلی زندگی کے تناظر میں "پوجا" اور "حملے" کے سیاق وسباق کو سامنے لاتا ہے اور یوں

انسان کے بعض اولیں ذہنی ارتعاشات سے آشنا کرتا ہے۔

میں تیغ ہاتھ میں لیے سوئے فلک گیا
جذبوں کے رس میں ڈوبے ہوئے چاند تک گیا
کافی تھا ایک وار مری تیغ تیز کا
مہتاب کے بدن سے لہو پھوٹ کر بہا
(شب خون)

وہ ویراں باغوں میں جاکر
چاند نکلتا دیکھتے ہیں
جب مشرق پر روشنی کا
اک تیز نشان چمکتا ہے
وہ سرگوشی کے لہجے میں
کچھ منتر پڑھنے لگتے ہیں
(ایک رسم)

ان نظموں کے چاند کو "ماہ منیر" کے "قمر" کے ساتھ ملا کر تو ایک نئے چاند سے سامنے ہوتا ہے۔اس چاند کے ساتھ قبائلی زندگی، پوجا یا جنگ کے تلازمے وابستہ۔

یہ کھلے منظروں کا چاند ہے جو قبائلی تصورات کی پراسراریت میں ڈوبا ہوا نہیں، بالکل شفاف اور صاف ہے۔

کھوہ کے باہر سبز جھروکا اس کے پیچھے چاند ہے
جس کی صاف کشش کے آگے رنگ زمیں کا ماند ہے
تیز ضیا چہروں پر آئی کیسے بندھن توڑ کے
کیسی دور دراز جگہوں کے دلکش منظر چھوڑ کے
مٹتے بنتے نقش ہزاروں گھٹتی بڑھتی دوریاں
ایک طرف پر وصل کا قصہ تین طرف مجبوریاں
(خاکی رنگ کی پریشانی میں خواب)

منیر اپنی بعض تازہ نظموں میں چاند سے سورج کی طرف سفر کرتا ہوا دکھائی دے رہا ہے اور ان نظموں میں سورج اور اس کی چمک

کے تلازمات ظاہر ہو رہے ہیں۔ اس کی کونیاتی سفر میرا دھیان بار بار حضرت ابراہیم کے قصے کی طرف منتقل ہوا، خصوصاً اس کے لیے بھی کہ اس مجموعے کا آغاز حمدیہ نظموں سے ہو رہا ہے۔ کونیات کا پھیلاؤ مظاہر سے آگے کسی عظیم تر حقیقت کے ادراک کے مرحلے سے بھی دوچار کرتا ہے یوں بھی اب منیر کی شاعری پر قرآن حکیم کے مطالعے کے اثرات واضح طور پر سامنے آنے لگے ہیں۔

میں منیر نیازی کی اس تازہ کتاب کے محض ایک رخ کا ذکر کیا ہے۔ منیر نیازی کے لہجے میں اب تفکر اور ارتکاز پیدا ہوا ہے وہ بھی دیکھنے کی چیز ہے۔ اسی طرح ان نظموں اور غزلوں میں اپنے عہد کی زندگی اور رویوں کا جو شعور ہے اس کا ذکر بھی ضروری ہے۔

منیر نیازی کا یہ مجموعہ اس کے فن کی نئی سمتوں اور ان نئی سمتوں سے آگے امکانی دنیاؤں کی خبر دیتا ہے۔

سہیل احمد، جون ۱۹۷۴ء لاہور

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم
کے نام

حمد

اُسی کا حکم جاری ہے زمینوں آسمانوں میں
اور ان کے درمیاں جو ہے، مکینوں و مکانوں میں

ہوا چلتی ہے باغوں میں تو اس کی یا د آتی ہے
ستارے چاند سورج ہیں سبھی اس کے نشانوں میں

اُسی کے دم سے طے ہوتی ہے منزل خواب بستی کی
وہ نام اک حرف نو رانی ہے ظلمت کے جہا نو ں میں

اُسی کے اسرار جہاں کا علم ہے سارا
وہی برپا کرے گا حشر آخر زمانوں میں

وہ کرسکتا ہے جو چاہے، ہر اک شے پر قادر ہے
وہ سن سکتا ہے رازوں کو جو ہیں دل کے خزانوں میں

بچا لیتا ہے اپنے دوستو ں کو خوف باطل سے
بدل دیتا ہے شعلوں کو مہکتے گلستانوں میں

منیر اس حمد سے رتبہ عجب حاصل ہوا تجھ کو
نظیر اس کی ملے شا ید پرانی داستانوں میں

حمد

شام شہر ہول میں شمعیں جلا دیتا ہے تو
یاد آ کر اس نگر میں حوصلہ دیتا ہے تو

آرزو دیتا ہے دل کو ، موت کی ، وقت دعا
میری ساری خواہشوں کا یہ صلہ دیتا ہے تو

حد سے بڑھ کر سبز ہوجاتا ہے رنگ زمیں
خاک میں اس نقش رنگیں کو ملا دیتا ہے تو

تیز کرتا ہے سفر میں موج غم کی یو ریشیں
بجھتے جاتے شعلہ دل کو ہوا دیتا ہے تو

ماند پڑ جاتی ہے جب اشجار پر ہر روشنی
گھپ اندھیری جنگلوں میں راستہ دیتا ہے تو

دیر تک رکھتا ہے تو ارض و سماں کو منتظر
پھر انہی ویرانوں میں گل کھلا دیتا ہے تو

جس طرف سے تو گزر جاتا ہے اے جان جہاں !
دور تک اک خواب کا منظر بنا دیتا ہے تو

اے منیر اس رات کو افلاک پر ہونا تیرا
اک حقیقت کو فسانہ سا بنا دیتا ہے تو

حمد

تسکیں اتارتا ہے دلو ں میں خدا کا نام
خوشبو بکھیرتا ہے گلوں میں خدا کا نام
دیتا ہے طائروں کو نواؤں کی دل کشی
رہتا ہے جن سے خا لی جگھوں میں خدا کا نام
آتا ہے مثل حرف بشارت دم سحر
باد سحر کے ساتھ گھروں میں خدا کا نام

حمد قدیم

کیسے گزرے شام
کیوں کر آئے یاد
وہ بھولا ہوا نام
بے چینی ہو دور
دل کو ملے آرام
کب یہ بے کل شام
رنج سے ہو یہ آزاد
کب یہ سونا باب
پھر ہوگا آباد
یہ دیوار آب
کیسے ہو پا یاب

جشن بہار میں حمد

مہر کی پیلی کرن اس کی آنکھ پر آکر پڑی
رنگ کچھ بدلا عجب اس چشم غم نے اس گھڑی

پر تو خورشید سے چمکے جھڑو کے شہر کے
پیپلوں کے باغ کے پتے ہرے ہونے لگے

بے وفائی خواب کی دل سے جدائی ہوتی گئی
اک صدا مشرق کے میداں میں ہوا ہوتی گئی

شہید کربلا کی یاد میں

خواب جمال عشق کی تعبیر ہے حسینؑ
شام ملال عشق کی تصویر ہے حسینؑ

جن گھروں سے ہم نے ہجرت کی

خانپور!ـــــــ اے خانپور!

تیری گلی میں تھی کیسی پیاری پیاری صورتیں

مسجدوں کے سبز دراور مندروں کی مورتیں

خانپور!ـــــــ اے خانپور!

کنڈا پانی کے پہاڑوں کی دراڑوں میں چھپے

صوفیوں کی خانقاہ ہیں تیری حد سے کچھ پرے

خانپور!ـــــــ اے خانپور!

آم کے تاریکی باغوں میں ہوا چلتی ہوئی

قوس اک رنگوں کی کوہ و دشت پر ڈھلتی ہوئی

خانپور!ـــــــ اے خانپور!

تیرے چپ دیوان خانوں میں بڑوں کے قہقے

شادیوں کی محفلوں میں چشم دلب کے جمگھٹے

خانپور!ـــــــ اے خانپور!

اپنے ہونے کی تسلی تیرے ہونے کا خیال

مٹ رہے ہیں رفتہ رفتہ یہ کشش انگیز جال

خانپور!ـــــــ اے خانپور!

اے حلال عید

اے ہلال عید !تیرا حسن وجہ راحت و آرام ہے
اے نشان نور تیری دید میرے صبر کا انعا م ہے
دیکھتی آنکھ تیرے روپ نیلے آسمان کے در میاں
ہے بہت ہی دور شہر خاک تجھ سے اے نگار زر فشاں
اے ہلال عید۔۔۔۔۔۔!
تو جھلک ہے شام کی تنہائی میں گہرے طرب کی جان جاں
اے کمان رنگ تیرے تیرے دل میں گلستان در گلستاں
اے ہلال عید۔۔۔۔۔۔!
منزل دشت وفا میں خواب عشرت کی حسیں محراتو
اک دیار گم شدہ کے کاخ دکو کا اک سنہری باب تو
اے ہلال عید۔۔۔۔۔۔!

اپنے وطن پر سلام

اے وطن! سلام کی امید گاہ آخری ، تجھ پر سلام
کل جہاں کی تیرگی میں اے نظر کی روشنی، تجھ پر سلام

تو ہوا قائم خدا کی برتری کے نام پر
بازوے حیدرؓ ، جمال احمدی کے نام پر
مرگ دانش کے جہا ں میں لہلہاتی زندگی ، تجھ پر سلام

تو بھی ہے ہجرت کدہ شہر مدینہ کی طرح
ھم نے بھی دہرائی ہے اک رسم آبا کی طرح
اے جلالِ حق کے مظہر، اے نشانِ سرخوشی تجھ پر سلام

میں ہو فانی ، حسن تیرا مستقل
یاد رکھنا مجھ کو بھی اے شمعِ دل !
سایہ افلاکِ نو میں اے بہارِ دائمی، تجھ پر سلام

اپنے شہروں کے لیے دعا

پاکستان کے سارے شہرو !
زندہ رہو ! پائندہ رہو !
روشنیوں رنگوں کی لہرو !
زندہ رہو ! پائندہ رہو !

عکس پڑے جس جگہ تمہارے
چمکیں زمینیں ان کی ضیا سے
میرے وطن کے چاند ستارو !
زندہ رہو ! پائندہ رہو !

موسم آئیں گزرتے جائیں
تم پر رنگ برستے جائیں

ارض خدا پہ مہکتے باغوں !
زندہ رہو ! پائندہ رہو !

باطل سے تم کبھی نہ ڈرنا
کفر کبھی نہ منظور کرنا
عظمت ہیبت کی دیوارو !
زندہ رہو ! پائندہ رہو !

حق کی رضا ہے ساتھ تمہارے
میری وفا ہے ساتھ تمہارے
نئے اجالوں کے سرچشمو !
زندہ رہو ! پائندہ رہو !

اپنے شہر کے لیے دعا

اے شہرِ بے مثال ! ترے بام و در کی خیر
اے حسنِ لازوال !ترے بام و در کی خیر

دیکھے ہے تو نے دور بہت آسمان کے
بیتے ہے تجھ پہ عہد بہت امتحان کے
اے قریہ جلال !ترے بام و در کی خیر
اک داستاں ہے ساتھ تیرے رنگ و نور کی

یاد ہے تیرے ساتھ بہت دور دور کی
خواب شب جمال ! ترے بام و در کی خیر

تسخیر تجھ کو کون کرے گا جہان میں
تو ہے خدا اور اس کے نبی کی امان میں
لاہور پر کمال !ترے بام و در کی خیر

ایک نیا شہر دیکھنے کی آرزو

ایک نگر ایسا بس جائے جس میں نفرت کہیں نہ ہو
آپس میں دھوکا کرنے کی ، ظلم کی طاقت کہیں نہ ہو

اس کے مکیں ہوں مسکن اور ہر طرح کے ہوں
اس کی ہوائیں ہرطرح کی ، اورگلشن اورطرح کے ہوں

شہر کو تو دیکھنے کا اک تماشہ چاہیے

ہے یہ ان کی زندگی کے روگ کا کوئی علاج
ابتدا ہی سے شاید شہر والوں کا مزاج
اپنے اعلیٰ آدمی کو قتل کرنے کا رواج

مارنے کے بعد اس کو دیر تک روتے ہیں وہ
اپنے کردہ جرم سی ایسے رہا ہوتے ہیں وہ

موسمِ سیرِ تنہائی میں آیندہ کا خیال

شام ہے ، تنہا ہوا باغوں میں ہے
کال کوئل کی صداؤں سے شجر زاروں میں ہے

رفعتوں پر جستجو اور ہجر کے نغموں کے دن
آنے والے موسموں کے اولیں خوابوں کے دن

اک عجب آئندہ کی تصویر کاخ وکو میں ہے
قریہ ظلمت نشاں کا خواب جمال ہو میں ہے

صبر کا ثمر

کئی طرح کے پھول تھے
رنگ و بو کے خواب سے

بہت ہی جلد کھل کے وہ
بہت ہی جلد مٹ گئے

مگر اسی بہار میں
بہت ہی دیر سے کھلا
وہ پھول اک گلاب کا
جو دیر تک کھلا رہا

بدلتے موسم کی رات ہے

بدلتے موسم کی رات ہے
میدانوں میں اندھیرا ہے
وہ سامنے اونچی کرسی کے مکانوں کی نیم روشنی میں
دروازوں کے باہر کھڑے
لوگ باتیں کر رہے ہیں؟
سیاست کی؟ محبت کی؟ جنگ کی؟
اشیائے صرف کی گرانی کی؟

گزرے ہوئے دنوں کی؟
آنے والے ماہ و سال کی؟
کچھ پتہ نہیں چلتا
بس دور سے ان کے ہونٹ ہلتے دکھائی دیتے ہیں

ایک عالم سے دوسرے عالموں کا خیال

نیلا گرم سمندر
اوپر دھوپ کا شیشہ چمکے
موتی اس کے اندر

یاد آئی ہیں باتیں کتنی
بیٹھ کے اس ساحل پر
اک بے مقصد عمر کے قصے
بوجھ ہیں جو اب دل پر

کیا کیا منظر دیکھے میں نے
کیسی جگہوں پر گھوما
کیسے مکانوں دن کاٹے
کن لوگوں میں بیٹھا

یہ منظر بھی یاد آئے گا
اور کسی موسم میں
اور کسی دریا کے کنارے
اور کسی عالم میں

دوست ستارے کو چمکتے رہنے کا اشارہ

ستارے ! مرے خواب امید کے
سحر آنے والی ہو یا شام غم

افق ہو سفر کا کہ بام الم
ہو کشت ثمرور کہ ویراں چمن

نیا شہر امکاں کہ یاروں کا بن
ستارے میرے خواب امید کے

اس رخ روشن کو دیکھنے کی تمنا

کس کے لیے وہ گیت لکھوں ــــــــ
سارے عالم کے شہروں میں جس کی گونج سنائی دے
جن کو سن کر چشم جہاں کو خواب اک نیا دکھائی دے
کس کے لیے وہ گیت لکھوں ــــــــ

آغازِ زمستاں میں دوبارہ

غروب مہر کا منظر گھڑی ہوئی گزرا
بس ایک پل کو نیستا ں اسی طرح لرزا

گیاہ سبز کی خوشبو اسی زمانے کی
اسی طرح کی مسرت بہار آنے کی

وہی جمال در وسقف و بام میں ہوں
کنار رود سیہ فام شام ہے میں ہوں

ایک بسر کیا ہوا منظر

مرے کمرے کے باہر شام جب ڈیرہ جماتی ہے
نگر کی مسجدوں سے گم اذاں کی گونج آتی ہے

شفق صحن مکاں میں رفتہ رفتہ مٹتی جاتی ہے
ہوا تاریک پتوں میں خوشی سے سرسراتی ہے

ستارہ خاک کی دیوار کے اوپر چمکتا ہے
کہ جس سے اس کا باغ اک میداں سا لگتا ہے

من و تو کی حدوں پر اداسی

خیال اتنے ہیں دل میں سمجھ نہیں آتے
سمجھ بھی آئیں اگر تو کہے نہیں جاتے

وہ سامنے بھی جو ہوتا تو اس سے کیا کہتے
بس اس کی باتیں سنتے ہم اور چپ رہتے

چمن کا زور زور فصیلوں کی انتہا تک ہے
یہ شور برگ بہاراں کا بس ہوا تک ہے

ساکت تصویروں کا باطن

اِک موسم میں سارے شجر بنجر بنجر سے لگتے ہیں
پھر بھی اندر ہرا ہے ان کا یوں اوپر سے لگتے ہیں
جیسے اچانک کبھی کھنڈر آباد نگر سے لگتے ہیں

دل ہیبت سے بھرے ہوئے اور چہرے ان کے خالی ہیں
جو کچھ ہے باطن میں ہے اور ظاہر جن کے خالی ہیں
آنکھ جمی ہے ان چہروں پر سارے عہد کے لوگوں کی
جیسے انہی کے پاس دوا ان کے سارے لوگوں کی

خاکی رنگ کی پریشانی میں خواب

کھوہ کے باہر سبز جھروکا اس کا کے پیچھے چاند ہے
جس کی صاف کشش کے آگے رنگ زمیں کا ماند ہے

تیز ضیا چہروں پر آئی کیسے بندھن توڑ کے
کیسی دور دراز جگہوں کے دل کش منظر چھوڑ کے

مٹتے بنتے نقش ہزاروں ، گھٹتی بڑھتی دوریاں
ایک طرف پر وصل کا قصہ ، تین طرف مجبوریاں

بارشوں کا موسم ہے

بارشوں کا موسم ہے
کوئلوں کی کو کو ہے
آم کے درخت کی
سبز، تیز خوشبو ہے

بے مثال تنہائی
بے کنار میداں کی
اک جھلک کہیں اس میں
آب بحر حیواں کی

اس کو یاد ہے جیسے
بات اس زمانے کی
دھوم اس کے دل میں ہے
ان دنوں کے آنے کی

ایک منزل پر ایک دعا

پھرتی ہوئی بے چین ہواؤ
میری مدد کو آؤ
اڑتی ہوئی ھم صداؤ !
میری مدد کو آؤ !
آؤ مل کر اس دنیا کو جنت کی تصویر بنادیں
امن اور حسن کا خواب مسرت آدم کی تقدیر بنادیں
یہ اک کام ہے جس میں آکر میرا ہاتھ بٹاؤ

پھرتی ہوئی بے چین ہواؤ !
اڑتی ہوئی ھم درد صداؤ !!

جنگ کے سائے میں جنتِ ارضی کا خواب

کبھی چمن کی شاخوں میں
کبھی فرشِ زمرد پر
یہ گلدم گا رہی ہے راگنی عہدِ محبت کی
کھلی، چٹیل زمینوں سے
غبارِ شام میں اڑتی
صدائیں گھر کو واپس آ رہے مسرور لوگوں کی
افق تک کھیت سرسوں کے
گلاب اور سبز گندم کے
حویلی کے شجر پر شور چڑیوں کے چہکنے کا
عجب حیرانیاں سی ہیں
مکانوں اور مکینوں میں
کہ موسم آ رہا ہے گاؤں کے جنگل مہکنے کا

حیرت کی منزل پر حسن کی نشانیاں

جیسے بارش ابھی ابھی تھمی ہے

ہوا ایسی ہے

کہیں کہیں سے، کبھی کبھی کسی کوئل کا نغمہ مہجوری

شام بہار دروازے پر دستک دے رہی ہے

نئے نئے نکلو ستاروں

اور چاند کی چکا چوند میں الجھی ہوئی یہ شام بھی عجیب ہے

دشمن کی طرف دوستی کا ہاتھ

میرے جسم میں زھر ہے تیرا
میرا دل ہے تیرا گھر

تو موجود ہے ساتھ ہمیشہ
خوف سا بن کر شام و سحر

تیرا اثر ہے میرے لہو پر
جیسے چاند سمندر پر

اتنی زرد ہے رنگت تیری
جم جاتی ہے اس پہ نظر

تو ہے سزا میرے ہونے کی
یا ہے میرا زاد سفر

کرے گا تو بیمار مجھے ، یا
بنے گا نامعلوم کا ڈر

رہے گا دائم گہری تہہ میں
جیسے اندھیرے میں کوئی در

گم کردے گا راہ میں مجھ کو
یا دے گا منزل کی خبر

تو ہے میرا دوست کہ دشمن
یہ تو بتا مجھ کو اے زار !

سفر کے طلسمات

اک بڑا ، خاکستری میدان تھا پھیلا ہوا
دور دور تک کچھ بھی نہ تھا ویراں درختوں کے سوا
یا پرانا سا کھنڈر اک پپلوں کے باغ کا

رات سر پر آگئی اور میں ابھی رستے میں تھا
پھر ہوا چلنے لگی اور میں ابھی رستے میں تھا

نیا سال

نیا سال آیا ہے
ویران صبحوں کی نیلی تہوں سے ابھرتا
خیابان دشت وجبل کی ٹھٹھرتی خموشی میں برفیلی سیٹی بجاتا،
دبے پاؤں آیا
یخ آلود شاموں کی خاموشیاں
اس کے قدموں کی آہٹ سمیٹے
گزرگاہوں پر، سائبانوں میں نوحہ کناں ہیں
در آتی ہے شب کو دریچوں کی درزوں سے
پرجوش جھونکوں کی بے مہر ٹھنڈک
برودت زدہ پانیوں پر، پرندے

کناروں پہ استادہ پیڑوں کی نمناک شاخوں کی جانب اڑے جا رہے ہیں

مکیں آنگنوں میں، چھتوں پر

دھڑکتے دلوں میں ہزاروں خیالوں کی شمعیں جلائے

دبے پاؤں آتے ہوئے سال کو دیکھتے ہیں

رنگ رنگیلے پنکھوں والے پنچھی ہوتے ہیں

رنگ رنگیلے پنکھوں والے پنچھی ہوتے ہیں

جب ساون کا مہینہ آتا

کالی گھور گھٹائیں لاتا

بوندوں کے سنگ راس رچاتے

ڈال ڈال پر شور مچاتے

ہرے پرے پتوں میں سوتے

رنگ رنگیلے پنکھوں والے پنچھی ہوتے ہیں

پھر پھولوں کی رت آجاتی

سارے جگ میں رنگ جماتی

کلی کلی سے نین ملاتے

پھولوں کا مکھ چومنے جاتے خوشبوؤں میں سدھ کھوتے

پھر اک ایسی رت بھی ہوتی

بجھنے لگتی جیون جوتی

ٹھنڈی ہواؤں میں اڑ جاتے

کسی جتن سے ہاتھ نہ آتے دور دیس میں بیٹھ کے روتے

رنگ رنگیلے پنکھوں والے پنچھی ہوتے

اگر میں راہ رو ہوتا

یہ کیسا راگ ہے یارو! دشت و در سے اٹھا ہے
یہ جن جن بستیوں کے پاس سے ہوکر گزرتا ہے
انھیں تاراج کرتا اور آگے اور آگے بڑھتا جاتا ہے
اگر میں راہ رو ہوتا اس کے ساتھ جاتا میں
میں اپنی آنکھ سے بربادیوں کے وہ مناظر دیکھتا
اور آہ بھرتا میں ــــــــــــ

مغں بھی ہوں اپنے ایک خواب میں مست

کوئی ہے شیشہ و شراب میں مست
کوئی ہے لذت شباب میں مست
مبتلا ہیں سبھی کہیں نہ کہیں
میں بھی ہوں اپنے خواب میں مست

ناحق سے ملنے ہم بھی اتنی دور گئے

ادھر ادھر کی لاکھوں باتیں
اصل جو تھی وہی بات نہ کی
بہت فسانے دنیا بھر کے
اصل کہانی یاد نہ تھی
وہی شناسا آنکھیں ، جن میں
میری کوئی پہچان نہ تھی
وہی گلابی ہونٹ تھے جن پر
میرے لیے مسکان نہ تھی
اس کے بعد بہت دن ٹھہرا
اس ان جانی بستی ہیں
بہت دنوں تک خاک اڑائی
اس میداں ہستی میں
اس کے سوا بھی لوگ بہت تھے
حسن کے جلوے اور بھی تھے
وہ بھی اس سے نہیں ملا پھر
ہم بھی اس سے نہیں ملے

غزل

خمار شب میں اسے میں سلام کر بیٹھا
جو کام کرنا تھا مجھ کو ، وہ کام کر بیٹھا

قبائے زرد پہن کر وہ بزم میں آیا
گل حنا کو ہتھیلی میں تھام کر بیٹھا

چھپا گیا تھا محبت کا راز میں تو مگر
وہ بھولپن میں سخن دل کا عام کر بیٹھا

جو سو کے اٹھا تو رستہ اجاڑ لگتا تھا
پہنچنا تھا مجھے منزل پہ ، شام کر بیٹھا

تھکن سفر کی بدن میں شل سا کر گئی ہے منیر
برا کیا جو سفر میں قیام کر بیٹھا

غزل

امتحاں ہم نے دیے اس دار فانی میں بہت
رنج کھینچے ہم نے اپنی لامکانی میں بہت

وہ نہیں اس سا تو ہے خواب بہار جاوداں
اصل کی خوشبو اڑی ہے اس کے ثانی میں بہت

رات دن کے آنے جانے میں یہ سونا جاگنا
فکر والوں کو پتے ہیں اس نشانی میں بہت

کوئلیں کوکیں بہت دیوار گلشن کی طرف
چاند و مکا حوض کے شفاف پانی میں بہت

اس کو کیا یادیں تھیں کیا اور کس جگہ پر رہ گئیں
تیز ہے دریائے دل اپنی روانی میں بہت

آج اس محفل میں تجھ کو بولتا دیکھا منیر
تو کہ جو مشہور تھا یوں بے زبانی میں بہت

غزل

اک مسافت پاؤں شل کرتی ہوئی سی خواب میں
اک سفر گہرا مسلسل زردی مہتاب میں

تیز ہے لوئے شگوفہ ہائے مرگ ناگہاں
گھر گئی خاک زمیں جیسے حصار آب میں

حاصل جہد مسلسل ، مستقل آرزدگی
کام کرتا ہوں میں جستجو نایاب میں

تنگ کرتی ہے مکاں میں خواہش سیر بسیط
ہے اثر دائم فلک کا صحن کی محراب میں اے منیر

اب اس قدر خاموشیاں ، یہ کیا ہوا !
یہ صفت آئی کہاں سے پارۂ سیماب میں

غزل

یہ آنکھ کیوں ہے یہ ھاتھ کیا ہے
یہ دن ہے کیا چیز رات کیا ہے

فراق خورشید و ماہ کیوں ہے
یہ ان کا اور میرا ساتھ کیا ہے

گماں ہے کیا اس صنم کدے پر
خیال مرگ و حیات کیا ہے

فغاں ہے کس کے لیے دلوں میں
خروش دریائے ذات کیا ہے

زمیں پہ حرف نجات کیا ہے
ہے کون کس کے لیے پریشاں

پتہ تو دے اصل بات کیا ہے
ہے لمس کیوں رائگاہ ھمیشہ

فنا میں خوف ثبات کیا ہے
منیر اس شہر غم زدہ پر

ترا یہ سحر نشاط کیا ہے

غزل

رہتا ہے اک ہراس سا قدموں کے ساتھ ساتھ
چلتا ہے دشت، دشت نوردوں کے ساتھ ساتھ

ہاتھوں کا ربطہ حرف خفی سے عجیب ہے
ملتے ہیں راز کی باتوں کے ساتھ ساتھ

اٹھتی ہوئی فصیل فغاں حد شہر پر
گلیوں کی چپ قدیم مکانوں کے ساتھ ساتھ

سورج کی آب زہر ہے رنگوں کی آب کو
ہے دور تک بخار سا باغوں کے ساتھ ساتھ

عریاں ہوا ہے ماہ شب ابرو باد میں
جیسے سفید روشنی غاروں کے ساتھ ساتھ

آیا ہوں میں منیر کسی کام کے لیے
رہتا ہے خیال سا خوابوں کے ساتھ ساتھ

غزل

غیروں سے مل کر ہی سہی ، بے باک تو ہوا
بارے وہ شوخ پہلے سے چلاک تو ہوا

جی خوش ہوا ہے گرتے مکانوں کو دیکھ کر
یہ شہر خوف خود سے جگر چاک تو ہوا

یہ تو ہوا کہ آدمی پہنچا ہے ماہ تک
کچھ بھی ہوا ، وہ واقف افلاک تو ہوا

کچھ اور وہ ہوا نہ ہوا مجھ کو دیکھ کر
یاد بہار حسن سے غم ناک تو ہوا

اس کشمکش میں ہم بھی تھکے تو ہیں اے منیر
شہر خدا ستم سے مگر پاک تو ہوا

غزل

سارے منظر ایک جیسے ، ساری باتیں ایک سی
سارے دن ہیں ایک سے اور ساری راتیں ایک سی

بے نتیجہ بے ثمر جنگ و جدول سود و زیاں
ساری جیتیں ایک جیسی' ساری ماتیں ایک سی

سب ملاقاتوں کا مقصد کاروبار زر گری
سب کی دہشت ایک جیسی' سب کی گھاتیں ایک سی

اب کسی میں اگلے وقتوں کی وفا باقی نہیں
سب قبیلے ایک ہیں اب ، ساری ذاتیں ایک سی

ایک ہی رخ کی اسیری خواب سے ،شہروں کا اب
ان کے ماتم ایک سے ، ان کی باراتیں ایک سی

ہوں اگر زیر زمیں تو فائدہ ہونے کا کیا
سنگ و گوہر ایک ہیں پھر ساری دھاتیں ایک سی

اے منیؔر ! آزاد ہو اس سحر یک رنگی سے تو
ہوگئے سب زہر یکساں ، سب براتیں ایک سی

غزل

اسیر خواہش قید مقام تو ہے کہ میں
نظام شمس و قمر کا غلام تو ہے کہ میں

ہے دونوں میں ظاہر ، ہے کون تو ہے کہ میں
چھپا ہوا ہے جو نظروں سے دام ، تو ہے کہ میں

نمائش مہ کامل پہ کس کا سایہ ہے
یہ اس کے چاروں طرف ابر شام تو ہے کہ میں

اڑا ہے رنگ در و بام و باراں سے
نگر کی اس گھنی چپ میں مدام تو ہے کہ میں

مکان دور سے آتی ہے اک صدا سی منیر
بھلا دیا جیسے سب نے وہ نام تو ہے کہ میں

غزل

نگر میں شام ہوگئی ہے کاہش معاش میں
زمیں پہ پھر رہے ہیں لوگ رزق کی تلاش میں

گزر گئی تمام عمر اس حصار تنگ میں
کشش ہے اک مریض سی مکاں کی بودو باش میں

ہلال حرف خوف سا فیصل سنگ نیل پر
ہے یا عدم کا زرد رنگ خواہش خراش میں

چمک رہے تھے تعزیے بلا کی تیز دھوپ میں
مہک ہے آب مرگ کی فشار عرق پاش میں

منیر حسن باطنی کو کوئی دیکھتا نہیں
متاع چشم کھوگئی لباس کی تراش میں

غزل

ابھی مجھے اک دشت صدا کی ویرانی سے گزرنا ہے
ایک مسافت ختم ہوئی ہے ، ایک سفر ابھی کرنا ہے

گری ہوئی دیواروں میں جکڑے سے ہوئے دروازوں کی
خاکستر سی دہلیزوں پر سرد ہواؤں نے ڈرنا ہے

ڈرنا جانا ہے دشت وجل نے تنہائی کی ہیبت سے
آدھی رات کو جب مہتاب نے تاریکی سے ابھرنا ہے

یہ تو ابھی آغاز ہے جیسے اس پہنائے حیرت کا
آنکھ نے سنور جانا ہے رنگ نے اور نکھرنا ہے

جیسے زرکی پیلا ہٹ میں موج خون اترتی ہے
زہر زر کے تند نشے نے دیدہ و دل میں اترتا ہے

غزل

تھکے لوگوں کو مجبوری میں چلتے دیکھ لیتا ہوں
میں بس کی کھڑکیوں میں سے یہ تماشے دیکھ لیتا ہوں

کبھی دل میں اداسی ہو تو ان میں جا نکلتا ہوں
پرانے دوستوں کو چپ سے بیٹھے دیکھ لیتا ہوں

چھپاتے ہیں بہت وہ گرمی دل کو ، مگر میں بھی
گل رخ پر اڑی رنگت کے چھینٹے دیکھ لیتا ہوں

کھڑا ہو یوں کسی خالی قلعے کے صحن ویراں میں
کہ جیسے میں زمینوں میں دفینے دیکھ لیتا ہوں

منیر اندازہ قعر فنا کرنا ہو جب مجھ کو
کسی اونچی جگہ سے جھک کے نیچے دیکھ لیتا ہوں

غزل

شام کے مسکن میں ویراں میکدر کا در کھلا
باب کھلی گزری صحبتوں کا خواب کے اندر کھلا

کچھ نہ تھا جز خواب وحشت وہ وفا اس عہد کی
راز اتنی دیر کا اس عمر میں آ کر کھلا

جگمگا اٹھا اندھیرے میں مری آہٹ سے وہ
یہ عجیب اس بت کا میری آنکھ پر جوہر کھلا

بن میں سر گوشی ہوئی آثار ابرو باد سے
بند غم سے جیسے اک اشجار کا لشکر کھلا

سبزۂ نو رستہ کی خوشبو تھی ساحل پر منیر !
بادلو ں کا رنگ چھتری کی طرح چڑ پر کھلا

غزل

پرے عکس آ کر نظر پر کئی
دیا اک تھا ، اس کے منظر کئی

کھلا تہ بہ تہ نیل گوں کا آسماں
مکاں اک تھا اس کے اندر کئی

بہت دور جا کر ملا وہ مجھے
کہ در ایک تھا اور پس در کئی

کئی رنگ پیدا ہوئے برق سے
پڑے عکس دیوار و در پر کئی

اُٹھا معبودوں سے اگر کا دھواں
ہوئے باغ اس سے معنبر کئی

ہوا شام کی آہ آوارہ تھی
ملے اس سے غم کے سمندر کئی

بہت خاک اڑنے لگی ہر طرف
کہ جیسے سفر میں ہوں لشکر کئی

سخن ایسا کس نے کیا شہر میں
نگر میں تھے یوں تو سخن ور کئی

منیر ان دنوں سے پریشاں نہ ہو
کہ دن ان سے گزرے ہیں ابر کئی

غزل

نیل فلک کے اسم میں نقش اسیر کے سبب
حسن ہے آب و خاک میں ماہ منیر کے سبب

وسعت شہر تنگ دل سرما کی صبح سرد میں
جاگی ہے ڈر کے خواب سے صوت فقیر کے سبب

سہم مکاں میں بند ہے دست دعائے آگہی
دل میں ہے شوق بے حساب حد کی لکیر کے سبب

زخم وجود کی دوا بس وہی آخری صدا
زندہ ہوں جس کے شوق میں صبر کبیر کے سبب

سحر ہے موت میں منیر جیسے ہے سحر آئینہ
ساری کشش ہے چیز میں اپنی نظیر کے سبب

غزل

سفر میں ہے جو ازل سے یہ وہ بلا ہی نہ ہو
کواڑ کھول کے دیکھو ، کہیں ہوا ہی نہ ہو

نگاہ آئینہ معلوم عکس نا معلوم
دکھائی دیتا ہے جو اصل میں چھپا ہی نہ ہو

زمیں کے گرد بھی پانی ، زمیں کی تہ میں بھی
یہ شہر جم کے کھڑا ہے جو تیرتا ہی نہ ہو

نہ جاکے اس سے پرے دشت مرگ ہو شاید
پلٹنا چاہے وہاں سے تو راستہ ہی نہ ہو

میں اس خیال سے جاتا نہیں وطن کی طرف
کہ مجھ کو دیکھ کے اس بت کا جی برا ہی نہ ہو

کٹی ہے جس کے خیالوں میں عمر اپنی منیر
مزا تو جب ہے کہ اس شوخ کو پتا ہی نہ ہو

غزل

نشیب وہم فراز گریز پا کے لیے
حصار خاک ہے پر ہر انتہا کے لیے

وفور نشہ سے رنگت سیاہ سی ہے میری
جلا ہوں میں عجب چشم سرمہ کے لیے

ہے اردگرد گھنا بن ہرے درختوں کا
کھلا ہے کسی دیوار میں ہوا کے لیے

زمیں ہے مسکن شر ، آسماں سراب آلود
ہے سارا عہد آلود میں کسی خطا کے لیے

اسیری پس آئینہ بقا اور تو
نکل کے آ بھی وہاں سے کبھی خذا کے لیے

کھڑا ہوں زیر فلک گنبد صدا میں منیر
کہ جیسے ہاتھ اٹھا ہو کوئی دعا کے لیے

غزل

کیسی کیسی بے ثمر یادوں کے بادلوں میں رہے
ہم بھی اتنی زندگی کیسے و بالوں میں رہے

اک نظر بندی کا عالم تھی نگر کی زندگی
قید میں رہتے تھے جب تک شہر والوں میں رہے

ہم اگر ہوتے تو ملتے تجھ سے بھی جان جہاں
خواب تھے ، نا پید دنیا کے ملالوں میں رہے

وہ چمکنا برق کا دشت و در و دیوار پر
سارے منظر ایک پل اس کے اجالوں میں ہے

کیا تھیں وہ باتیں جو کہنا چاہتے تھے وقت مرگ
آخری دم یار اپنے کن خیالوں میں رہے

دور تک مسکن تھے بن ان کی صداؤں کے منیر
دیر تک ان ناریوں کے غم شوالوں میں رہے

غزل

آئینہ اب جدا نہیں کرتا
قید میں ہوں ، رہا نہیں کرتا

مستقل صبر میں ہے کوہ گراں
نقش عبرت صدا نہیں کرتا

رنگ محفل بدلتا رہتا ہے
رنگ کوئی نہیں کرتا

عیش دنیا کی جستجو مت کر
یہ وفینہ ملا نہیں کرتا

جی میں آئے جو کر گزرتا ہے
تو کسی کا کہا نہیں کرتا

ایک وارث ہمیشہ ہوتا ہے
تخت خالی رہا نہیں کرتا

عہد انصاف آرہا ہے منیر
ظلم دائم ہوا نہیں کرتا

غزل

چاند نکلا ہے سر قریہ ظلمت دیکھوں
ہوگئی کیسی سیہ خانوں کی رنگت دیکھوں

سامنے جو ہے اسے آنکھ کا دھوکا سمجھو
ان دیاروں کو سدا خواب کی صورت دیکھو

سیر ہے جیسے کوئی ، ایسے جہاں سے گزرو
دور تک پھیلا ہے اک عرصہ فرقت دیکھو

خوف دیتا ہے یہاں ابر میں تنہا ہونا
شہر در بند میں دیواروں کی کثرت دیکھو

زرکی پر چھائیں جو پڑتی ہے چمک اٹھتا ہے
آدم خاک کی بے ہوشی میں حالت دیکھو

سا یہ ان پر بہت بھولی ہوئی یادوں کا
شام آئی ہے پری زادوں میں وحشت دیکھو

داغ ہے اس کے نہ ہونے سے دلوں میں ابتک
اڑ گیا مثل صباء ، گل کی حقیقت دیکھو

جنگلوں میں کوئی پیچھے سے بلائے تو منیر
مڑ کے رستے میں کبھی اس کی طرف مت دیکھو

غزل

مَیں سُن رہا ہوں اسے جو سنائی دیتا نہیں
میں دیکھتا ہوں اسے جو دکھائی دیتا نہیں

بہت قیام کی خواہش سفر میں آتی ہے
طلسم شام غریباں رہائی دیتا نہیں

ہے شوق انجمن آرائی حسن کو بھی ، مگر
مجال اس کو غم رونمائی دیتا نہیں

وصال عرض و سما کا سماں ہے جیسے کوئی
اندھیرا اتنا ہوا ، کچھ سجھائی دیتا نہیں

منیؔر کھول دے بڑھ کر در دیار ندا
خموش رہتا ہے کیوں اب دہائی دیتا نہیں

غزل

اور ہے کتنی منزلیں باقی
جان کتنی ہے جسم میں باقی

زندہ لوگوں کی بود و باش میں ہیں
مردہ لوگوں کی عادتیں باقی

اس سے ملنا وہ خواب ہستی میں
خواب معدوم ، حسرتیں باقی

بہہ گئے رنگ و نور کے چشمے
رہ گئیں ان کی رنگیں باقی

جن کے ہونے سے ہم بھی ہے اے اول !
شہر میں ہیں وہ صورتیں باقی

وہ تو آ کے ، منیر ! جا بھی چکا
اک مہک سی ہے باغ میں باقی

غزل

کوئی حد نہیں ہے کمال کی
کوئی حد نہیں ہے جمال کی

وہی قرب و دور کی منزلیں
وہی شام خواب و خیال کی

نہ مجھے ہی اس کا پتہ کوئی
نہ اسے خبر میرے حال کی

یہ جواب میری صدا کا ہے
کہ صدا ہے اس کے سوال کی

یہ نماز عصر کا وقت ہے
یہ گھڑی ہے دن کے زوال کی

وہ قیامتیں جو گزر گئیں
تھی امانتیں کئی سال کی

ہے منیر تیری نگاہ میں
کوئی بات گہرے ملال کی

غزل

یہ کیسا نشہ ہے، میں کس عجب خمار میں ہوں
تو آ کے جا بھی چکا ہے، میں انتظار میں ہوں

مکاں ہے قبر، جسے لوگ خود بناتے ہیں
میں اپنے گھر میں ہوں یا میں کس مزار میں ہوں

درِ فصل کھلا، یا پہاڑ سرے سا ہٹا
میں اب گری ہوئی گلیوں کے مرگ زار میں ہوں

میں ہوں بھی اور نہیں بھی، عجیب بات ہے
یہ کیسا جبر ہے میں کس کے اختیار میں ہوں

منیر دیکھ شجر، چاند اور دیواریں
ہوا خزاں کی ہے سر پر، شب بہار میں ہوں

غزل

آ گئی یاد شام ڈھلتے ہی
بجھ گیا دل چراغ جلتے ہی

کھل گئے شہرِ غم کے دروازے
اک ذرا سی ہوا کے چلتے ہی

کون تھا تو کہ پھر نہ دیکھا تجھے
مِٹ گیا خواب آنکھ ملتے ہی

خوف آتا ہے اپنے ہی گھر سے
ماہِ شب تاب کے نکلتے ہی

تو بھی جیسے بدل سا جاتا ہے
عکسِ دیوار کے بدلتے ہی

خون سا لگ گیا ہے ہاتھوں میں
چڑھ گیا زہر گل مسلتے ہی

غزل

بارشوں میں اس سے جا کے ملنے کی حسرت کہاں
کوکنے دو کوئلوں کو ، اب مجھے فرصت کہاں

جی تو کہتا ہے کہ اس کو ساتھ ہی رکھیں مگر
اپنے پاس اس حسن عیش انگیز کی قیمت کہاں

تلخ اس کو کردیا ارباب قریہ نے بہت
ورنہ اک شاعر کے دل میں اس قدر نفرت کہاں

روک سکتے تھے اس ہم ابتدا کے دور میں
اب ہمیں دیوانگی شہر پر قدرت کہاں

دیکھتا ہوں ہر طرف ، شاید دکھائی دے کبھی
پر فراخ دشت میں آدم کی وہ صورت کہاں

ایک منزل یہ بھی تھی خوابوں کی ورنہ اے منیر
میں کہاں اور اس دیار غیر کی غربت کہاں

غزل

مثال سنگ کھڑا ہے اسی حسیں کی طرح
مکاں کی شکل بھی دیکھو دل مکیں کی طرح

ملائمت ہے اندھیرے میں اس کی سانسوں سے
دمک رہی ہیں وہ آنکھیں ہرے رنگیں کی طرح

نواح قریہ ہے سنسان شام سرما میں
کسی قدیم زمانے کی سرزمیں کی طرح

زمیں دور سے تارہ دکھائی دیتی ہے
رکا ہے اس پہ قمر چشم سبز میں کی طرح

فریب دیتی ہے وسعت نظر کی افقوں پر
ہے کوئی چیز وہاں سحر نیلمیں کی طرح

منیر عہد ہے اب آخر مسافت کا
کہ چل رہی ہے ہوا باد واپسیں کی طرح

غزل

ڈر کے کسی سے چھپ جاتا ہے جیسے سانپ خزانے میں
زر کے زور سے زندہ ہیں سب خاک کے اس ویرانے میں

جیسے رسم ادا کرتا ہوں شہروں کی آبادی میں
صبح کو گھر سے دور نکل کر شام کو واپس آنے میں

نیلے رنگ میں ڈوبی آنکھیں کھلی پڑی تھیں سبزے پر
عکس پڑا تھا آسمان کا شاید اس پیمانے میں

دبی ہوئی ہے زیرِ زمیں اک دہشت گنگ صداؤں کی
بجلی سی کہیں لرز رہی ہے کسی چھپے تہ خانے کی

دل کچھ اور بھی سرد ہوا ہے شامِ شہر کی رونق سے
کتنی ضیا بے سود گئی شیشے کی لفظ جلانے میں

میں تو منیر آئینے میں خود تک کر حیران ہوا
یہ چہرہ کچھ اور طرح تھا پہلے کسی زمانے میں

غزل

شہر، پربت ، بحروبر کو چھوڑتا جاتا ہوں میں
اک تماشا ہورہا ہے دیکھتا جاتا ہوں میں

ہوش اڑتا جارہا ہے گرمی رفتار میں
دیکھتا جاتا ہوں میں اور بھولتا جاتا ہوں میں

ابر ہے افلاک پر اور اک سرا سیمہ قمر
ایک دشت رائیگاہ میں ڈورتا جاتا ہوں میں

ہوں مکاں میں بند ، جیسے امتحاں میں آدمی
سختی دیوارو در ہے جھیلتا جاتا ہوں میں

شوق ہے جن کے پیچھے چل رہا ہوں میں منیر
رنج ہیں کچھ میں میرے ، کھینچتا جاتا ہوں میں

غزل

ایک میں اور اتنے لاکھوں سلسلے کے سامنے
ایک صوت گنگ جیسے گنبدوں کے سامنے

مٹتے جاتے نقش دود دم کی آمدرفت سے
کھلتے جاتے بے صدا لب آئینوں کے سامنے

ہے ہوائے سیر آب اور اجنبی سی سرزمیں
اڑ رہی ہے خاک ، کہنہ ساحلوں کے سامنے

آگ جلتی ہے گھروں میں کوئی تصویر ہے
یادگار جرم آدم خاکیوں کے سامنے

دشمنی رسم جہاں ہے ، دوستی حرف غلط
آدمی تنہا کھڑا ہے ظالموں کے سامنے

چار چپ چیزیں ہیں بحروبر ، فلک اور کوہسار
دل دہل جاتا ہے ان خالی جگہوں کے سامنے

باطن زر دار پر اسرار ہے ، جیسے منیر
کان زر کی بند ہیبت مشعلوں کے سامنے

غزل

ڈرے ہوؤں کو مگر اعتبار کس کا تھا
تمام عمر ہمیں انتظار کس کا تھا

اڑا غبار ہوا سے تو راہ خالی تھی
وہ کون شخص تھا اس میں ، غبار کس کا تھا

لیے پھر جو مجھے در بدر زمانے میں
خیال تجھ کو دل بے قرار ! کس کا تھا

روش سے ہٹ کے بنے اک مکان نو کے قریب
وہ خوں تھا کس کا ، وہ پھولوں کا ہار کس کا تھا

یہ جبر مرگ مسلسل ہی زندگی ہے منیر
جہاں میں اس پہ کبھی اختیار کس کا تھا

غزل

سحر کے وقت یہ کیا میں نے خواب سا دیکھا
سفید ابر ہرے رنگ میں گھرا دیکھا

بس ایک پل کا تماشا کنار صحرا پر
پھر اس کے بعد اسے دشت میں ہوا دیکھا

قدیم قریوں میں موجود تو خدائے قدیم
جدید شہروں میں بھی تجھ کو رونما دیکھا

منیر شہر محمد میں جاکے دیکھیں ذرا
بلاد کفر میں خود کو بہت گنوا دیکھا

غزل

شانِ ہنر ، کلام سخن ور بھی کچھ نہیں
عجز فقیرو کبر تو نگر بھی کچھ نہیں

بنیاد کچھ نہیں ہے کسی شے کی اس جگہ
اس شہر میں بہائے سکندر بھی کچھ نہیں

رشتہ روایتوں سے بھی باقی نہیں رہا
آئندہ کے سفر کے افق پر بھی کچھ نہیں

شامِ فراقِ یار وہی ، دشت و در وہی
دریائے غم کے پار کا منظر بھی کچھ نہیں

لا حاصلی ہی شہر کی تقدیر ہے منیر
باہر بھی گھر سے کچھ نہیں ، اندر بھی کچھ نہیں

غزل

تھکن سے راہ میں چلنا محال بھی ہے مجھے
کمال پر بھی تھا میں ہی ، لازوال بھی ہے مجھے

سڑک پہ چلتے ہوئے رک کے دیکھتا ہوں میں
یہیں کہیں ہے تو یہ احتمال بھی ہے مجھے

یہ میرے گرد تماشا ہے آنکھ کھلنے تک
میں خواب میں تو ہوں لیکن خیال بھی ہے مجھے

اسی کے لطف سے مرنے سے خوف آتا ہے
اسی کے ڈرنے سے یہ جینا محال آتا ہے

سوادِ شامِ سفر ہے جلا جلا سا منیر
خوشی کے ساتھ عجب سا ملال بھی ہے مجھے

غزل

آئی ہے اب یاد کیا رات اک بیتے سال کی
یہی ہوا تھی باغ میں ، یہی صدا گھڑیال کی

مہک عجب سی ہوگئی پڑے پڑے صندوق میں
رنگت پھیکی پڑ گئی ریشم کے رومال کی

شہر میں ڈر تھا موت کا ، چاند کی چوتھی رات کو
اینٹوں کی اس کھوہ میں دہشت تھی بھونچال کی

شام جھکی تھی بحر پر ، پاگل ہوکر رنگ سے
یا تصویر خواب میں ، میرے کس خیال کی

عمر کے ساتھ عجیب سا بن جاتا ہے آدمی
حالت دیکھ کے دکھ ہوا ، آج اس پری جمال کی

دیکھ کے مجھ کو غور سے ، پھر وہ چپ سے ہوگئے
دل میں خلش ہے آج تک ، اس ان کہے سوال کی

غزل

خوش ہے جیسے اب رہا ہوکر پرانے بار سے
ارض تیرا ہو چلی تھی کثرت اشجار سے

شہر میں دیوانگی دیدار ماہ نو سے ہے
منظروں پہ رنگ سا ہے شام کے آثار سے

ہے مثال سنگ ، دل اس نرگس بیمار کا
ہے بخار آنکھوں میں اس کی حسن کے آزار سے

وہ صدا میری خلائے کوہ و دشت و بحر میں
خوف و قید صدا کا حرف کی تکرار سے

ایک محراب آسماں کے درمیان بام و در
اک دیے کی لو نمایاں روزن دیوار سے

ہوگئے اُس سے جدا بس سوچ کر کچھ جی میں ہم
بات کیا ہم نے نکالی خامشی یار سے

تابش خورشید میرے جسم میں ہے اے منیر
چشمِ شب حیراں ہے میرے پر تو سیار سے

غزل

مکاں میں قید صدا کی دہشت
مکاں سے باہر خلاں کی دہشت

ہوا ہے خوف خدا سے خالی
ہے اس نگر میں بلا کی دہشت

گھرا ہوا ہوں میں اس میں ہر طرف سے
ہے آئینے میں ہوا کی دہشت

زمیں پہ ہر سمت حد آخر
فلک پہ لا انتہا کی دہشت

شجر کے سایے میں موت دیکھو
ثمر میں اس کے فنا کی دہشت

بدن ہے ہشیار دل کے ڈر سے
نظر میں آواز پا کی دہشت

کھڑی ہے رستے کی منزلوں پر
مناظر دیر پا کی دہشت

سراب سا اک گزر رہا ہے
وہی ہے پھر چشم وا کی دہشت

منیر خوں میں اتر رہی ہے
قرار بے مدعا کی دہشت

غزل

اُگا ہ سبزہ دیوار پر آہستہ آہستہ
ہوا خالی صداؤں سے نگر آہستہ آہستہ

گھرا بادل خموشی سے خزاں آثار باغوں پر
ہلے ٹھنڈی ہواؤں میں شجر آہستہ آہستہ

بہت ہی سست تھا منظر لہو کے رنگ لانے کا
نشاں آخر ہوا یہ سرخ تر آہستہ آہستہ

چمک زر کی اسے آخر مکان خاک میں لائی
بنایا ناگ نے جسموں میں گھر آہستہ آہستہ

مرے باہر فصیلیں تھیں غبار خاک و باراں کی
ملی مجھ کو ترے غم کی خبر آہستہ آہستہ

منیر اس ملک پر آسیب کا سایہ ہے یا کیا ہے
کہ حرکت تیز تر ہے اور سفر آہستہ آہستہ

غزل

لازم نہیں کہ اس کو بھی میرا خیال ہو
جو میرا حال ہے وہی اس کا بھی حال ہو

کچھ اور دل گداز ہوں اس شہر سنگ میں
کچھ اور پر ملال ، ہوائے ملال ہو

باتیں تو ہوں کچھ تو دلوں کی خبر ملے
آپس میں اپنے کچھ تو جواب و سوال ہو

رہتے ہے آج جس میں جسے دیکھتے ہیں ہم
ممکن ہے یہ گزشتہ کا خواب و خیال ہو

سب شور شہر خاک کا ہے قرب آب سے
پانی نہ ہو تو شہر کا جینا محال ہو

معدوم ہوتی جاتی ہوئی شے ہے یہ جہاں
ہر چیز اس کی جیسے فنا کی مثال ہو

کوئی خبر خوشی کی کہیں سے ملے منیر
ان روز و شب میں ایسا بھی اک دن کمائی ہو

غزل

آسمان اک سایہ جیسے خالی ہاتھوں پر
اور زمیں اک مار خاک کا قیمتی دھاتوں پر

سودوزیاں کے اندیشے بھی اس کی بزم میں تھے
ورنہ یقیں اور ہم کر لیتے اس کی باتوں پر

پورا باغ دمک اٹھا تھا گہری روشنی میں
رنگ برق سفر میں تھا بھیگی برساتوں پر

سناٹا جنگل کی طرح ہے ان دیواروں کا
دشمن کا دھوکا ہوتا ہے شہر کی راتوں پر

جسم کا خون سمٹ آیا تھا ڈری نگاہوں میں
زر کی زردی کھنڈی ہوئی تھی پیلے ماتھوں پر

مجھے منیر افسوس ہوا ہے کر کے یاد اسے
کبھی کبھی دکھ بھی ہوتا ہے گزری باتوں پر

انتظار حسین

ہجرت کا ثمر

دراصل میں اور منیر نیازی جنت سے ایک ہی وقت میں نکالے گئے تھے ہم نے ایک دوسرے کو اسی حیثیت میں پہچانا ہے۔ چلتے پھرتے کسی موڑ ہماری مدھ بھیڑ ہوتی ہے۔ منیر نیازی سنانے لگتا ہے کہ بستی میں آموں کے کیسے گھنے پیڑ تھے۔ میں بیان کرنے لگتا ہوں کہ اپنی بستی میں شام کیسے پڑتی تھی اور مور کس رنگ سے بولتا تھا منیر نے ہمیشہ اس طرح سنایا اور سنا جیسے وہ یہ داستان پہلی مرتبہ سنا رہا اور پہلی سن رہا ہے۔ ایک ملال کے ساتھ سناتا ہے اور ایک حیرت کے ساتھ سنتا ہے۔ ہم اپنی گمشدہ جنت اپنے دھیان میں بسائے پھرتے ہیں۔ اوروں کے تصور میں بھی ایسے بسا تو رہنا چاہیے تھا۔ مگر لگتا یوں ہے کہ سب نے کسی نہ کسی رنگ سے اس کی تلافی کر لی ہے یا ضعف حافظہ ہمارا دشمن بن گیا۔ حافظے نے بی بی حوّا کو بھی ستایا تھا۔ جنت سے نکلنے کے بعد انھیں جنت ایک عمر تک یاد آتی رہی۔ انہوں نے جنت کو بہت یاد کیا اور بہت روئیں۔ جنت کی یاد بہنے والے آنسو جو زمین پر گرے ان سے مہندی کے پیڑ اگے "قصصا الانبیا" میں لکھا ہے کہ روئے ارض پر جتنے مہندی کے پیڑ ہے وہ سب بی بی حوا کا فیض ہے۔

مجھے مہندی کے پیڑ اور منیر کے شعر اچھے لگتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ ان میں تھوڑی میری آنکھوں کی نمی بھی شامل ہے۔ جب منیر اپنے خانپور کو پکارتا ہے تو میرا بھی ایک بستی کو پکارنے کو جی چاہتا ہے۔ جب وہ باغوں اور جنگل کا ذکر کرتے ہے تو میں اسے سی عالم میں چھوڑنے کر اپنے جنگل کی نکل جاتا ہوں۔ ہماری بستی کا جنگل کچھ بہت گھنا نہیں تھا مگر میری یادوں نے اسے گھنا بنا دیا ہے۔ جب میں منیر نیازی کے شعر پڑھتا ہوں تو لگتا ہے کہ یہ جنگل اور زیادہ گھنا ہو گیا ہے اور زیادہ پھیل گیا ہے۔ سو اپنا جنگلا ور گھنا ہو گیا ہے، اور زیادہ پھیل گیا ہے سو اب اپنا جنگل بہت گھنا اور بہت پھیلا ہوا ہے۔ اپنے جنگل میں چلتے چلتے میں اچانک کسی اور ہی جنگل میں جا نکلتا ہوں، زیادہ بڑے اور زیادہ پرہول جنگل میں۔ مجھے ڈر لگنے لگتا ہے، جیسے میں عہد قدیم میں سانس لے رہا ہوں۔ شاید عہد قدیم ہمارے بچپن کے منطقے کے آس پاس ہی واقع ہے۔ یا پھر منیر نیازی نے اپنے شعروں کوئی عجیب سی پگڈنڈی بنا دی ہے کہ وہ خانپور سے چل کر میری بستی کو چھوتی ہوئی عہد قدیم میں جا نکلتی ہے۔ تو اب صورت یہ ہے کہ میں منیر کہ شعر پڑھتے ہوئے اپنے بچپن کے راستے عہد قدیم میں جا نکلتا ہوں۔ بچپن کے اندیشے اور وسوسے عہد قدیم کے آدمی کے وسوسوں اور اندیشوں سے جا ملتے ہیں۔

جنگلوں میں کوئی پیچھے سے بلائے تو منیر
مڑ کے رستے میں کبھی اس کی طرف مت دیکھوں

مگر مجھے لگتا ہے کہ خود منیر نے مڑ کر دیکھ لیا ہے۔

وسوسے اور اندیشے عہد قدیم سے آج تک آتے آتے آدمی کے اندا اتر گئے ہیں۔ اب ہم باہر سے ہم ہمت والے ہیں، اندر سے خوف زدہ ہیں۔ پہلے ہم مڑ کر نہیں دیکھتے تھے، اب اندر دیکھنے سے ڈرتے ہیں۔ کیا بھی کوئی جنگل ہے؟ جنگل اصل میں پہلے ہمارے باہر تھا، اب ہمارے اندر ہے۔ ہم تو جنگل سے نکل آئے اور بڑے بڑے شہر تعمیر کر کے اپنے چاروں طرف فصیلیں کھڑی کر لیں۔ مگر جنگل ہماری بے خبری میں ہمارے اندر اتر گیا اور سات پردوں میں چھپ کر بیٹھ رہا۔ اب وہ ہمارے سو رہا ہے۔ منیر نیازی وہ شخص ہے جس کے اندر جنگل جاگ اٹھا ہے اور سنسنا رہا ہے۔ اس نے مڑ کے جو دیکھ لیا ہے۔ اس کی شاعری کو پڑھتے ہوئے لگتا ہے کہ ہم جنگل میں چل رہے ہیں۔ اور پاتال میں اتر رہے ہیں۔ عجب عجب تصویریں ابھرتی ہیں۔

دبی ہوئی ہے زیر زمیں اک دہشت گنگ صداؤں کی
بجلی سی کہیں لرز رہی ہے چھپے تہ خانے میں

کرے گا تو بیمار مجھے یا
بنے گا نا معلوم کا ڈر
رہے گا دائم گہری تہ میں
جیسے اندھیرے میں کوئی در

پھر میرے تصور میں عجب عجب تصویریں ابھرنے لگتی ہیں میں اپنے پاتال میں اترنے لگتا ہوں۔ اگلی پچھلی کہانیاں اور بھولے بسرے قصے یاد آنے لگتے ہیں۔ چمکتی دمکتی اشرفیوں سے بھری زمین دوز دیگیں۔ راجہ باسٹھ۔ راجہ باسٹھ کے محل کے سنہری برج جو زمین کے اندھیرے میں جگمگ جگمگ کرتے ہیں۔ میری نانی اماں بہت سنایا کرتی تھیں کہ زمین میں دبی دیگیں کس طرح اندر ہی اندر سفر کرتی ہیں اور پکارتی ہیں اور جب کسی کو یہ پکار سنائی دے جاتی ہے تو اس پر کیا بیتتی ہے۔ ان کی باتیں اسی پکار کو سننے کی خواہش کی غمازی کرتی تھیں۔ مگر وہ ڈرتی بھی رہتی تھیں، کہیں سچ مچ کسی سنسان اندھیری رات میں یہ پکار انھیں سنائی نہ دے جائے۔ سانپ ان دیگوں کی رکھوالی کرتا ہے۔ میری نانی اماں بتاتی تھیں کہ سانپوں کا ایک راجہ ہے، اسے وہ راجہ باسٹھ کہتی تھیں، ہندو دیومالا کے تذکروں میں اس کا نام راجہ بسوکا لکھا ہے۔ اس کا محل سونے کا بنا ہوا ہے اور پاتال کے اندھیرے میں جگمگاتا ہے۔ میری نانی اماں سانپ کا نام شاذ و نادر ہی لیتی تھیں۔ اشاروں کنایوں میں اس کا ذکر کرتی تھیں۔ منیر نیازی بھی اس کا نام لینے سے ڈرتا تھا مگر اس کا ذکر بہت کرتا ہے۔ اتنا خوف اور اتنی کشش! آخر کیوں؟

نامعلوم کا خوف اور نامعلوم کے لیے کشش! اس خوف اور کشش کی صورت منیر نیازی کی شاعری میں کچھ ایسی ہے جیسے آدم حوا ابھی

ابھی جنت سے نکل کر زمین پر آئے ہے۔زمین ڈرا بھی رہی ہے اور اپنی طرف کھینچ بھی رہی ہے پاتال بھی ایک بھید ہے اور وسعت بھی ایک بھید ہے۔بھید بھری فضا کبھی اس حوالے سے پیدا ہوتی ہے اور کبھی اس حوالے سے شعر کے ساتھ دیوملائی قصے اور پرانی کہانیاں لپٹی چلی آتی ہیں۔

سفر میں جو ازل سے یہ وہ بلا ہی نہ ہو　　کواڑ کھول کے دیکھو،کہیں ہوا ہی نہ ہو
نہ جا کہ اس سے پرے دشت مرگ شاید　　پلٹنا چاہے وہاں سے تو راستا ہی نہ ہو

منیر نیازی کے لیے زمین اپنے پاتال اور اپنے پھیلاؤ کے ساتھ دہشت و حیرت سے بھرا ایک تجربہ ہے۔مگر پھر وہی سوال کہ آخر کیوں؟ کیا اس کا تعلق بھی جنت سے نکلنے کے قصے سے ہے؟ کیا یہ ہجرت کا ثمر ہے؟ مہندی کے یہ پیڑ خود بخود تو نہیں اگ آئے۔قدیم آدمی کے تجربے ہمارے آپ کے اندر دیومالاؤں اور داستانوں کے اندر اندر دبے پڑے ہیں۔آخر کوئی واقعہ تو ہوا ہے کہ یہ تجربے پھر سے زندہ ہوئے اور ایک نئی معنویت اختیار کر گئے۔

ہجرت کا تجربہ لکھنے والوں کی ایک پوری نسل اردو ادب کی باقی نسلوں سے الگ کرتا ہے۔اس نسل کے مختلف لکھنے والوں کے یہاں اس تجربے نے الگ الگ روپ دکھائے ہیں۔منیر نیازی کے یہاں اس کے فیض سے ایسا روپ ابھرا ہے جو ایک نئی دیومالا کا سا نقشہ پیش کرتا ہے باقی نئی شاعری کا کیا ہے،وہ تو کسی تجربے کے حوالے کے بغیر خالی ٹی ہاؤس میں بیٹھ کر بھی ہو سکتی ہے۔